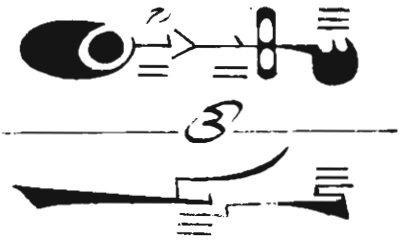

جناب میجر محمد حامد صاحب۔ کاکول

جشنِ ہزارہ کے موقع پر ہونے والی مجلسِ مذاکرہ میں
پڑھا گیا

سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریکِ جہاد برِصغیر کی تاریخ میں ایک خاص اہمیّت رکھتی ہے، یوں تو تاریخ نے بڑے بڑے معرکے دیکھے، سلطنتوں کا عروج و زوال دیکھا اور بڑے بڑے جرنیلوں کو میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھا لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں سیّد احمد شہیدؒ کی اٹھائی ہوئی تحریک کا ثانی شاید ہی دیکھنے میں آئے۔ اس وقت مختلف تاریخی تفصیلات سے قطع نظر تحریک کا ایک طائرانہ جائزہ لینا مطلوب ہے۔

رائے بریلی کے سادات کے خاندان کے چشم و چراغ سیّد احمد ٹونک میں فوجی تربیّت اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ سے علمی و روحانی تربیّت سے فیض یاب ہونے کے بعد فریضۂ حج کیلئے ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ نکلے۔ یہ حج اگلی منزل یعنی جہاد کے لئے ایک تیاری کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں رائے بریلی سے یہ قافلۂ حق اس منزل کیلئے نکلا جہاں سے اسے جہاد کی گھاٹی سے گذرتے ہوئے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہونا تھا۔ راجپوتانہ کے لق و دق صحرا، درّۂ بولان کی سختیاں، قندھار اور کابل کی کوہ پیمائیاں بالآخر پشاور آمد میں منتج ہوئیں، مقصد یہ تھا کہ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو جو سکھوں کے مظالم تلے بے حمیّتی کی زندگی بسر کر رہے تھے، جہاد کے ذریعہ آبرومندانہ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے جب قومیں زندگی کی آسائشوں کو موت کی سختی پر ترجیح دینے لگیں تو عزّت کا منصب ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں برِصغیر کی کہانی بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ یہ نہ تھا کہ اب لاہور میں مسلمان نہ رہتے تھے لیکن شاہی مسجد کے مینار اذانوں سے محروم ہو چکے تھے۔ اور اس کا صحن اصطبل کا روپ دھار چکا تھا۔ شاہی مسجد قرطبہ کی مسجد سے صرف اسی حد تک مختلف تھی کہ وہاں مسلمانوں کا جسمانی وجود تک ختم کیا جا چکا تھا جبکہ یہاں حمیّت اور غیرت سے خالی لاشے گلیوں میں چلتے پھرتے اب بھی نظر آتے تھے۔ یہی نہ تھا خود سرحد میں سکھوں کو خراج ادا کیا جا رہا تھا۔ وہی

قلعہ اٹک جس پر کبھی مغلوں کے پھریرے لہرائے اور جسکی مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں گونجی تھیں، سکھوں کے قبضے میں جاچکا تھا۔ دین جو کبھی قوت و شوکت کا پیام لئے ہوئے تھے صرف مسجدوں کی چار دیواریوں تک محدود ہو چکا تھا۔ ایسے نادانوں کی کمی نہ تھی جو اس سجدے کی آزادی کو اسلام کی آزادی پر محمول کر رہے تھے۔

ان تیرہ و تار حالات میں سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اپنے ساتھیوں کے ایک مختصر سے قافلے سمیت باطل کی قوت سے نبرد آزما ہونے کیلئے ہزاروں میل کا طول و طویل سفر طے کر کے اس سرزمین کیطرف نکلے جو برصغیر میں اسلام کے قافلے کا پہلا پڑاؤ رہا تھا۔ وہ درۂ خیبر کو جس راستے سے ترک افغان و مغل سپاہ کبھی برصغیر کی ظلمتوں کو روشنی سے بدلنے کیلئے آئی تھیں، روندتے ہوئے جب پشاور پہنچے تو انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی قلتِ تعداد پر نظر نہ کی اور سکھوں کی بے پناہ قوت کو پرِکاہ کے برابر سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ: كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (کتنے ہی مختصر گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہوں پر غالب آتے ہیں۔)

جب عزم و ہمت کے یہ پیکر دل میں اللہ پر بے پناہ ایمان اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نافذ کرنے کا جذبہ لئے میدان میں اترے تو اکوڑہ خٹک کا میدان سکھوں کی لاشوں سے پٹ گیا۔ وہ اپنی تعداد کی قلت کے باوجود اس علاقے کی سب سے بڑی قوت کے مقابلے میں غالب آئے۔ اس معرکے میں خلعتِ شہادت پانے والوں میں مظفر نگر کے فہیم خان تھے تو سندھ کے سید عبدالرحمٰن اور حسن خان، دہلی کے شیخ مخدوم اور کریم بخش تھے تو لکھنؤ کے مرزا ہمایوں بیگ قندھار کے ملا قطب الدین اور ملا لعل محمد تھے تو ملیح آباد کے غلام حیدر خان بھی ان میں شامل تھے۔ الغرض برصغیر کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے یہ جوان مرد اکوڑہ کی خاک کو اپنے خون کے چھینٹوں سے سیراب کر گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اکوڑہ کے معرکے میں دشمن کے مقابلے میں قربانیوں کا مطالبہ پورا ہوا تو اپنوں کے زخموں کو جھیلنے کی تاب بھی لانا پڑی۔ وہ سید جو رائے بریلی سے جہاد کے راستے پر گامزن ہوئے تھے نہ غیروں کے دئے ہوئے زخموں سے گھبرائے نہ اپنوں کی جراحتوں پر تلملائے انہوں نے کشادہ روئی سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ؎

روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ　　　آنجا کہ نطعہ ہائے یداللہ می زنند

پنجتار، زیدہ، ہنڈ، تربیلہ، ستھانہ اور امب کے معرکوں سے گزرتا ہوا یہ قافلۂ حق بالاکوٹ کی اس آخری منزل پر پہنچا جو ایک تحریک جہاد کا نقطۂ اختتام تھا، تو ایک دوسرے جہاد کی منزل کا نقطۂ آغاز

۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کی سرزمین پر حق و باطل کی رزم آرائی ایک اور انداز سے ہو رہی تھی۔ آج پانچ برس کی مسلسل جدوجہد، دن رات کی کوششوں اور بے تاب روحوں کے جہدِ لازوال کے بعد وہ منزل آ پہنچی تھی جہاں ہار جیت کا مسئلہ نہ تھا کہ منزلِ مقصود سر کھونے کی تھی، سر کو سلامت رکھنے کی نہ تھی ؎

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

شہیدین کی تحریک بالاکوٹ میں ختم نہیں ہوئی، زندگی سے چوگان کی گیند کی طرح کھیلنے والے آسودۂ خاک ہوئے۔ لیکن ان کی کوششوں کا نتیجہ اس خطۂ زمین میں ایک نئی زندگی کی صورت میں نکلا۔ آنے والی ایک صدی کی جدوجہد کے ہر عنوان پر ہمیں انہی شہیدوں کی سرخی نظر آتی ہے۔ بالاکوٹ میں شہیدوں کے خون کی مشعل ستھانہ سے لیکر وزیرستان تک روشنی کا سامان کرتی رہی۔ سکھوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور انگریز یہاں آئے تو انہیں ایک دن کیلئے چین نصیب نہ ہوا۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۹۰۰ء تک کے ۵۱ سالوں میں ۵۲ لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سے ۶ بڑے معرکوں کی سعادت موجودہ ہزارہ ڈویژن کو نصیب ہوئی، ان میں سے صرف ایک معرکہ امبیلا جس میں دس ہزار انگریز سپاہ ماری گئی، سرحد کی تاریخ کا سب سے بڑا معرکہ تھا۔ یہ ستھانہ کے خاندان اور مجاہدین کی مشترکہ قیادت میں لڑا گیا۔ کوہستان سیاہ (کالا ڈھاکا) کی لڑائیاں ہوں یا وزیرستان میں بہادر محسودوں کے خلاف انگریزوں کے حملے سب میں شہیدین کے نام لیواؤں کا خون بہا اور ان کی تدابیر فتح مندیوں کا سبب بنیں۔ ۱۸۳۱ء میں بہنے والا خون ۱۹۴۷ء تک سرحد کی سرزمین کے چپے چپے کو گلنار کرتا اور گرماتا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ ہمیں ان گمنام مجاہدوں کے نام نہیں بتاتی جو بنگال کی سرزمین سے لے کر قندھار تک پھیلے ہوئے علاقے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان کا تعلق صرف اور صرف اللہ کی ذات سے تھا جس کی راہ میں سر کٹانے سے بہتر کوئی نصب العین ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔ یہ سکھوں اور انگریزوں کے خوانِ نعمت سے گری پڑی ہڈیاں اٹھانے والے اور ان کے دئے ہوئے تمغے سینے پر سجانے والے لوگوں میں سے نہ تھے۔ ان کو کوئی جاگیر یا خطاب عطا نہیں ہوا، انہوں نے اپنے ابنائے وطن کی اٹلی سے جاپان تک بکھری ہوئی لاشوں پر اپنی عظمت کے مینار کھڑے نہیں کئے۔ تاریخ نے انہیں انگریز ڈپٹی کمشنروں سے لے کر وائسرائے تک کے درباروں کی کرسیوں پر جگہ پانے کے لئے اپنی غیرت کو نیلام کرتے نہیں دیکھا۔ ان کی اولاد ڈون سکول ڈیرہ دون اور ایچیسن کالج کی روشوں پر چلتی چلتی اقتدار کے دریچوں تک نہیں پہنچی، لیکن شہادت گاہ پر گرے خون کے ایک ایک قطرے پر کتنی ہی سلطنتوں کا غرور قربان کیا جا سکتا ہے۔ ان کے گھوڑوں کے سموں سے اڑتی چنگاریوں پر کتنے ہی عشرت کدوں کی جگمگاتی روشنیاں تصدق کی جا سکتی ہیں۔ آج تک کالا ڈھاکا کے غازی ہاشم خان سے لے کر وزیرستان کے شہزادہ فضل دین تک

باقی ص ۲۷ پر

محترمہ ڈاکٹر قادر بخش۔ فیصل آباد

مسائل اور ہماری ذمہ داریاں

جنوبی بحرالکاہل کا علاقہ وسیع و عریض رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اور چھوٹے بڑے ہزارہا جزائر پر مشتمل ہے۔ مگر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر نیوکیلی ڈونیا، اور فیجی کے جزائر میں مقیم ہیں۔ نیوزی لینڈ میں مسلم آبادی نہایت قلیل ہے، یعنی تیس لاکھ کی کل آبادی میں دو ہزار پانچ سو کے قریب۔ مسلمانوں کی ایک تنظیم انجمن حمایت اسلام کے علاوہ انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن آف نیوزی لینڈ (انکارپوریٹڈ) اور مسلم طلباء کی بھی ایک تنظیم یہاں کے سب سے بڑے شہر آک لینڈ میں موجود ہے۔ یہاں پر ایک مسلم مدرسہ اور مسجد زیر تعمیر ہیں۔ علماء جو جدید علوم سے بھی بہرہ ور ہیں اور مبلغین نیز اسلامی لٹریچر کی کمی یہاں شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

آسٹریلیا کی سوا کروڑ سے زیادہ آبادی میں کوئی پندرہ ہزار سے زائد مسلمان ہیں۔ جن میں بلقان ریاستوں کے مہاجر اور تارکین وطن بھی شامل ہیں۔ تمام بڑے شہروں میں مساجد، اسلامی سوسائٹیاں اور طلباء کی تنظیمیں قائم ہیں اور آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسل ان سب کی مرکزی تنظیم ہے۔ یہاں بھی مستند علماء کی اشد ضرورت ہے۔ اور انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر نیز مسلم سکول کی کمی بھی یہاں کے اہم مسائل ہیں۔ جزائر نیوکیلی ڈونیا جو کہ پہلے فرانسیسی استعمار کے زیر اثر تھا۔ وہاں بھی ایک ہزار سے کم مسلمان موجود ہیں جنکا اصل تعلق صومالیہ افریقہ سے ہے۔ اور یہاں بھی اسلامی سکول، مسجد اور مسلمانوں کی تنظیم کی سخت ضرورت ہے۔

جزائر فیجی کے حالات کا جائزہ ہم ذرا تفصیل سے لیں گے۔

یہ چھوٹے بڑے جزائر جن کی تعداد ۸۴۴ کے قریب ہے ۷۲۰۰ مربع میل کے رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں رقبہ کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ دو بڑے جزیروں وٹی لیوو (VITI LEVU) اور وانا لیوو (VANUA LEVU) نے گھیر رکھا ہے۔ دارالحکومت سووا (SUVA) سڈنی سے تقریباً ۱۹۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ فیجی میں ۶۰ انچ سے ۱۲۰

انچ سالانہ تک بارش ہوتی ہے۔ آب و ہوا مرطوب ہے، اور درجہ حرارت تقریباً سارا سال یکساں رہتا ہے۔ (۲۴ ف)
بڑی پیداوار گنا اور ناریل ہے۔ کیلے، مچھلی، مینگانیز دھات سونا اور سیاحت بھی بڑے ذرائع آمدنی ہیں۔

ان جزائر کو ۱۶۴۳ء میں ایبل ٹیسمین (ABEL TASMAN) نے دریافت کیا۔ کیپٹن کک (COOK) یہاں ۱۷۷۴ء میں پہنچا۔ اور ۱۷۹۷ء میں کیپٹن ولسن فیجی میں آیا۔ مگر باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ جزائر فیجی کا سروے ۱۸۴۰ء میں ایک امریکی ٹیم نے کیا۔ اور تین ماہ میں یہ مطالعاتی دورہ مکمل ہوا۔

اب یورپی لوگوں سے فیجی کے روابط قائم ہوئے اور یورپ کے اچھے اور برے اثرات بھی ادھر پہنچنے لگے یورپ کی بیماریاں مثلاً خسرہ وغیرہ ادھر آئیں اور اسلحہ اور شراب و منشیات کا داخلہ بھی ممکن ہوا۔ زیادہ تر یورپین فیجی میں تاجروں کے بھیس میں آئے، کچھ آسٹریلیا کے مفرور ملزم تھے، اور کچھ ملاحوں اور مشنریوں کے روپ میں یہاں پہنچے۔ ۱۷۹۷ء میں کچھ پروٹسٹنٹ مشنریوں نے عیسائیت کا پرچار شروع کیا۔ یہاں کے اصل باشندوں کا آبائی مذہب بت پرستی اور ماوراء العقل عقائد و توہمات پر مبنی تھا۔ اور ان میں سے بعض قبائل آدم خوری جیسی وحشیانہ عادات بد میں مبتلا تھے۔ عیسائیت کیلئے منظم کام یہاں لندن مشنری سوسائٹی نے شروع کیا، جس نے بعد میں عیسائیوں کے ویزلین گروپ سے اشتراک عمل کر لیا۔

ساتھ ساتھ سفید فام استعمار اپنی مکارانہ فریب کاریوں سے یہاں قدم جماتا گیا۔ قبائلی سرداروں کی باہمی خانہ جنگی بھی ان کے کام آئی۔ یہاں کی صندل کی لکڑی کی تجارت بھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی جس کی چین، ہندوستان وغیرہ میں بہت مانگ تھی۔ ان لوگوں نے یہاں گنا اور کپاس کی کاشت بھی شروع کی اور مقامی لوگوں سے انہی کی زمین پر جبری کاشت کاری کروائی۔ سفید فاموں کے مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر اور اپنے یورپی مشیروں کے کہنے پر فیجی کے بادشاہ نے ۱۸۵۹ء میں ملک کو برطانیہ کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر برطانیہ نے ان حالات میں یہ پیشکش قبول نہ کی۔ بعد میں ایک تفتیشی کمیٹی کی سفارشات پر جو وہاں کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی، یہ جزائر غیر مشروط طور پر برطانیہ کے حوالے کر دئیے گئے۔ اور ۱۰ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو فیجی کو برطانوی نو آبادی قرار دے دیا گیا۔ برطانیہ کی نظر فیجی کی بلحاظ محل وقوع فوجی اہمیت اور نیوزی لینڈ و آسٹریلیا کی ہمسائیگی کے علاوہ یہاں ایک عمدہ بندرگاہ ملنے کے امکان اور کپاس اور گنے کی پیداوار پر بھی تھی۔

شروع میں عیسائیت کو جزائر فیجی میں اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ مگر بعد میں جب یورپی عہدے داروں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تو لوگ تیزی سے عیسائی ہونے لگے۔ ۱۸۵۴ء میں جب یہاں کا بادشاہ دکم بو عیسائی ہوا تو اس مذہب کو بہت تقویت ملی۔ آج یہ لوگ پکے عیسائی ہیں جن میں ۸۵ فیصد میتھوڈسٹ ۱۲ فیصد رومن کیتھولک اور باقی دوسرے فرقے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں فیجی میں عیسائیت کے سو سال پورے ہونے پر یہاں صد سالہ